عطاالرحمٰن قاضی

میر کا نشاطیہ لب ولہجہ

کبھی کبھار یوں بھی ہوتا ہے کہ کسی شاعر کے بارے میں مغالطہ آمیز رائے اس قدر عام ہو جاتی ہے کہ وہ کلیشے کا درجہ اختیار کر لیتی ہے۔ پھر عوام تو عوام، خواص بھی اس رائے کا صبح و شام ورد کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ میر تقی میر اردو غزل کے ان شعراء میں سرفہرست ہیں جن کے بارے میں ''شاعرِ غم'' جیسی ترکیب کی مقبولیت نے ان کی شاعری کی متنوع جہات کو ہم پر منکشف نہیں ہونے دیا۔ ''شاعرِ غم'' کی ترکیب کو اس قدر قبولِ عام حاصل ہوا کہ ان کی شاعری کے دیگر پہلو بڑی حد تک دب کر رہ گئے۔ اس مغالطے سے نکل کر ہی ہم اردو غزل کے ایک بڑے شاعر کی تفہیم کا حق ادا کر سکتے ہیں۔

اگر ہم کلامِ میر کا بالاستیعاب مطالعہ کریں تو یہ بات فوراً واضح ہو جاتی ہے کہ میر کی شاعری کا اصل موضوع غم نہیں ہے بلکہ انسان، اس کے تجربات، جذبات اور محسوسات ہیں۔ ان تجربات، جذبات اور محسوسات کے پیچھے اس عہد کے سیاسی، سماجی اور معاشرتی حالات کے ساتھ ساتھ مذہبی نظریات کے عمل دخل سے انکار ممکن نہیں۔

ایک نارمل انسان اپنی روزمرہ زندگی میں مختلف جذبات کا اظہار کرتا ہے وہ تکلیف دہ حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر خود کو 'اشک شوئی' پر مجبور پاتا ہے اور جب کبھی کسی خوش کن واقعے سے دوچار ہوتا ہے تو ایک سرخوشی کی لہر اس کے روئیں روئیں میں رقص کرنے لگتی ہے۔ میر کی شاعری میں جو انسانی کردار (عاشق کے روپ میں) دکھائی دیتا ہے ایک عام انسان ہے جو تکلیف دہ باتوں پر اگر غمگین ہوتا ہے اور خود کو کسی اندرونی تحریک کے زیرِ اثر اشک شوئی پر مجبور پاتا ہے تو مسرت زا لمحوں سے مسرت کشید کرنے سے بھی گریز نہیں کرتا۔

یہ بالکل بجا ہے کہ میر کی شاعری میں غم کا عنصر بحیثیتِ مجموعی غالب ہے لیکن یہ بھی

Scanned by CamScanner

ایک حقیقت ہے کہ اگر غم کا مضمون بھی جملہ فنی خصوصیات سے ہم آہنگ ہو جائے تو وہ قاری پر خوش گوار تاثر مرتب کرتا ہے۔ میرؔ کے غم انگیز اشعار کا ایک حصہ اپنے آہنگ، تراکیب اور تشبیہات کی وجہ سے قاری کو بالعموم جاں گداز محزونی کیفیت میں مبتلا کرنے کے بجائے ایک نشاطیہ کیفیت سے دوچار کرتا ہے۔ میرؔ کا بنیادی لہجہ حزینہ سہی لیکن جہاں کہیں انہوں نے غم کو نشاطِ غم میں تبدیل کیا ہے، ایسی شاعری منظرِ عام پر آئی ہے جو غموں کی دھوپ سے جھلسے ہوئے لوگوں کے لیے ایسا مرہم بن جاتی ہے جو غم کی شدت میں تخفیف کا باعث بننے کے ساتھ ساتھ قاری کے دل میں ایک ہلکا سا نشاطیہ احساس ضرور پیدا کرتی ہے۔ پروفیسر شکیل الرحمن لکھتے ہیں کہ:

> ''المیہ کے تجربوں میں کیفیتِ انبساط پیدا کر کے جمالیاتی تسکین کا سامان غالباً اردو شاعری میں سب سے پہلے میرؔ صاحب ہی نے فراہم کیا ہے۔''[1]

المیہ کے تجربات میں انبساط کی کیفیت صرف اور صرف اس وقت پیدا ہو سکتی ہے جب فنی و جمالیاتی تقاضوں سے روگردانی نہ کی جائے۔ چند ایک اشعار ملاحظہ کیجیے:

ہر اشک مرا ہے دُرِ شہوار سے بہتر
ہر لختِ جگر رشکِ عقیقِ یمنی ہے

یک قطرہ خون ہو کے پلک سے ٹپک پڑا
قصّہ یہ کچھ ہوا دلِ غفراں پناہ کا

مرے منہ پہ رکھا ہے رنگ اب تلک
ہزار آفریں چشمِ خوں بار کو

گلچیں سمجھ کے چنیو کہ گلشن میں میرؔ کے
لختِ جگر پڑے ہیں نہیں برگ ہائے گل

Scanned by CamScanner

عمر بھر ہم رہے شرابی سے
دلِ پرخوں کی اک گلابی سے

مندرجہ بالا اشعار میں دردانگیز مضامین باندھے گئے ہیں مگر لہجے میں خوش طبعی کا جو عنصر موجود ہے وہ قاری پر غم، مایوسی یا سلبی کیفیات طاری نہیں کرتا بلکہ اس کی تالیفِ قلب کا سامان فراہم کرتا ہے۔ گویا میرؔ انسان کے ازلی وابدی دکھ سے حلاوت کشید کرنے کے فن سے بخوبی آگاہ ہیں۔ المیہ کی جمالیات (Aesthetics of Tragedy) کے حامل اشعار اتنی بڑی تعداد میں اردو کے کسی اور شاعر کے ہاں موجود نہیں ہیں۔

بہت سے مابعد الطبیعاتی موضوعات کو بھی انہوں نے اس انداز میں تغزل کا لبادہ اوڑھایا ہے کہ پڑھنے والا بے اختیار سر دھننے لگتا ہے۔ شوخی، تحیر، سرمستی اور ڈرامائی عناصر کی بدولت بے رحم سنجیدگی انحطاط پذیر ہوگئی ہے اور متصوفانہ مضامین بڑے دلکش اسلوب میں ڈھل گئے ہیں۔ چند اشعار دیکھیے:

کیا جانوں بزمِ عیش کہ ساقی کی چشم دیکھ
میں صحبتِ شراب سے آگے سفر کیا

کوئی ہو محرمِ شوخی ترا تو میں پوچھوں
کہ بزمِ عیش جہاں کیا سمجھ کے برہم کی

دور ہی سے ہوش کھو دیتی ہے اس کی بوئے خوش
آپ میں رہیے تو اس کے پاس کی ٹک جائیے

کچھ نہ دیکھا پھر بجز یک شعلہ پُر پیچ و تاب
شمع تک تو ہم نے دیکھا تھا کہ پروانہ گیا

کہاں آتے میسر تجھ سے مجھ کو خودنما اتنے
ہوا یوں اتفاق آئینہ تیرے روبرو ٹوٹا

Scanned by CamScanner

گہ گل ہے گاہ رنگ گہے باغ کی ہے بو
آتا نہیں نظر وہ طرح دار اک طرح

میرؔ کے ہاں اس شاعرانہ مزاج کی تلاش تو بے سود ہے جو غالبؔ کا خاصہ ہے البتہ رندی و شگفتہ مزاجی کے حامل اشعار میرؔ کے کلام میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ اسی طرح ناصح، واعظؔ، زاہدؔ اور محتسب سے چھیڑ چھاڑ کا رویہ جو اردو شاعری کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے ہے میرؔ کے ہاں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

شیخ جو تھا مسجد میں ننگا رات کو تھا مے خانے میں
جُبہ، خرقہ، کرتا، ٹوپی مستی میں انعام کیا
داڑھی سفید شیخ کی تو مت نظر میں کر
بگلا شکار ہووے تو لگتے ہیں ہاتھ پر

خمریات اور بہاریہ موضوع کے حامل اشعار بھی غم زدوں کے دل و دماغ میں سرخوشی کی کیفیت پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ چند اشعار دیکھیے:

گل گل شگفتہ مے سے ہوا ہے نگار دیکھ
اک جرعہ ہم دم اور پلا پھر بہار دیکھ
نکلی ہیں اب کے کلیاں اس رنگ سے چمن میں
سر جوڑ جوڑ جیسے مل بیٹھتے ہیں احباب
موسم ہے نکلے شاخوں سے پتے ہرے ہرے
پودے چمن میں پھولوں نے دیکھے بھرے بھرے
گلشن میں آگ لگ رہی تھی رنگ گل سے میرؔ
بلبل پکاری دیکھ کے صاحب پرے پرے

Scanned by CamScanner

عہد جنوں ہے موسم گل کا اور شگوفہ لایا ہے
ابر بہاری وادی سے اٹھ آبادی پر آیا ہے

چلتے ہو تو چمن کو چلیے سنتے ہیں کہ بہاراں ہیں
پھول کھلے ہیں پات ہرے ہیں کم کم بادوباراں ہیں

میر کی شاعری کا ایک حصہ حیاتی شاعری (Sensous Poetry) کے ذیل میں آتا ہے۔ حیاتی شاعری کا اطلاق جن اشعار پر ہوتا ہے، ان کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر مسز افتخار بیگم صدیقی لکھتی ہیں کہ:

''حسیاتی شاعری کا اطلاق ان اشعار پر ہوتا ہے جن میں شاعر ایسے الفاظ اور علامتیں استعمال کرے جو براہِ راست ہمارے محسوسات یا کسی احساس کو متاثر کریں اور ہم اس حسی تجربے میں شاعر کے ساتھ شریک ہو جائیں جن کا اظہار شعر میں کیا گیا ہے۔ یہ تجربہ بصری بھی ہو سکتا ہے سمعی بھی، لمسیاتی بھی اور اس کا تعلق قوتِ شامہ سے بھی ہو سکتا ہے۔ حسیاتی شاعری کی جڑیں تصور کی بجائے انسانی تجربوں میں پیوست ہوتی ہیں۔ اس میں خارجیت ضرور ہوتی ہے مگر یک رخی خارجیت نہیں ہوتی بلکہ اس میں داخلیت کا عمل بھی شامل رہتا ہے''۔ [۲]

میر کے کلام میں ایسے اشعار وافر تعداد میں موجود ہیں جو ہماری حسیات کو براہِ راست متاثر کرتے ہیں۔ ولی اردو کے وہ پہلے شاعر ہیں، جن کے ہاں حسیاتی شاعری اپنے عروج پر دکھائی دیتی ہے مگر ولی کے ہاں خارجیت کا عنصر بہر حال داخلیت پر غالب ہے اس کے علی الرغم میر ہاں کے داخلیت اور خارجیت کا حسین امتزاج دیکھنے کو ملتا ہے۔ میر جب محبوب کے جسم کا تذکرہ کرتے ہیں تو ان کے جملہ احساسات بیدار ہو جاتے ہیں بالخصوص قوتِ باصرہ اور قوتِ لامسہ کی زود حسی نے ان کی حیاتی شاعری میں وہ دل کشی

Scanned by CamScanner

پیدا کی ہے جو بہت کم شعراء کو نصیب ہوتی ہے۔ اسے میرؔ کی خلاقانہ صلاحیت اور تجربے کی سچائی کہیے کہ قاری بھی ان کے حسی تجربات میں سہیم و شریک ہو جاتا ہے۔ میرؔ جب محبوب کے جسم کا ذکر کرتے ہیں تو ساکن اور متحرک تصاویر کا ایک سلسلہ ہماری آنکھوں کے سامنے پھیلتا چلا جاتا ہے کہیں وہ حسن فطرت اور حسن محبوب کے ادغام سے ایسا منظر نامہ تشکیل دیتے ہیں جس کا سحر قاری کی بصری اور لمسی حسیات کو فوراً اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ میرؔ حسنِ محبوب کو نمایاں کرنے کے لیے جن تشبیہات کو پیش کرتے ہیں وہ اپنی رنگینی و رعنائی کی بدولت قاری کے لیے جنتِ نگاہ کا سامان فراہم کرتی ہیں۔ میرؔ کے ہاں عشق کی تقویم میں اگرچہ فراق کے لمحات اور بے مہری معشوق کا زمانہ طویل ہے لیکن جب کبھی عاشق کو وصل کے لمحات نصیب ہوتے ہیں وہ ان سے ہر ممکن طریقے سے رس کشید کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ محبوب کے حسن کا قصیدہ خواں بھی نظر آتا ہے اور محبوب کی جسمانی قربت کا خواہاں بھی، اور جب اسے یہ قربت نصیب ہوتی ہے تو پھر دور دور تک غم کی پرچھائیں دکھائی نہیں دیتی۔ ہجر جب وصال میں تبدیل ہوتا ہے تو میرؔ جسم کے لذت آمیز تجربے کو اس قدر والہانہ پن سے بیان کرتے ہیں کہ پڑھنے والا خود کو سرمستی و سرشاری کی ایسی کیفیت میں پاتا ہے جس کو لفظوں میں اسیر کرنا ممکن نہیں۔

گل شرم سے بہہ جائے گا گلشن میں ہو کر آب سا
برقع سے گر نکلا کہیں چہرا ترا مہتاب سا

لیتی ہے ہوا رنگ سراپا سے تمہارے
معلوم نہیں ہوتے ہو گلزار میں صاحب

کیا لطف تن چھپا ہے مرے تنگ پوش کا
اگلا پڑے ہے جامے سے اس کا بدن تمام

شعلوں کے ڈانک گویا لعلوں تلے دھرے ہیں
چہروں کے رنگ ہم نے دیکھے ہیں کیا جھمکتے

کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے
اس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے

میرؔ ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

نازکی اس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

یاقوت کوئی ان کو کہے ہے کوئی گلبرگ
ٹک ہونٹ ہلا تو بھی کہ اک بات ٹھہر جائے

آج ہمارے گھر آیا ہے کیا ہے یاں جو نثار کریں
الّا کھینچ بغل میں تجھ کو دیر تلک ہم پیار کریں

لطف اس کے بدن کا کچھ نہ پوچھو
کیا جانیے جان ہے کہ تن ہے

جس جائے سراپا میں نظر جاتی ہے اس کے
آتا ہے مرے جی میں یہیں عمر بسر کر

ہائے جوانی وصل میں اس کے کیا کیا لذت پاتے تھے
بوسۂ گنجِ لب سے پھر بھی ذائقے اپنے بناتے تھے

مندرجہ بالا اشعار میرؔ کے مزاج اور افتادِ طبع کو سمجھنے میں بھی بہت معاونت کرتے ہیں۔ فراق زدہ، ہجر میں گھلتے رہنے والا، بد دماغی اور چڑچڑے پن کا ہمہ وقت مظاہرہ کرنے والا شخص بھلا کب حسن فطرت اور حسن محبوب سے متمتع ہو سکتا ہے۔ یہ اشعار میرؔ کی ایسی شخصیت کو بے نقاب کرتے ہیں جو صرف رونا اور آنسو بہانا ہی نہیں جانتا بلکہ مسکرانے کے فن سے بھی بخوبی آگاہ ہے۔

Scanned by CamScanner

میر کے ہاں درویشانہ لب ولہجہ بھی ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ درویش کا دعائیہ لہجہ اس قدر محبت آمیز ہے کہ وہ قاری کو محزونی کیفیت میں مبتلا کرنے کی صلاحیت سے یکسر محروم ہے۔ یہ اشعار ایک خاص تہذیبی تناظر کو بھی سامنے لا رہے ہیں۔

فقیرانہ آئے صدا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

درویش ہیں ہم آخر دو اک نگہ کی فرصت
گوشے میں بیٹھے پیارے تم کو دعا کریں گے

میر کی ظرافت کئی مقامات پر ابتزال کی حدوں کو چھو رہی ہے۔ مثال کے طور پر چند اشعار دیکھیے:

کیا جو عرض کہ دل سا شکار لایا ہوں
کہا کہ ایسے تو میں مفت مار لایا ہوں

ہے گی تو دو سالہ پر پے دخترِ رز آفت
کیا پیرِ مغاں نے بھی اک چھوکری پالی ہے

ساتھ کے پڑھنے والے فارغ تحصیل علمی سے ہُوے
جہل کے مکتب کے لڑکوں میں ہم دل بہلاتے ہیں ہنوز

گیا لڑکے دلّی کے ہیں عیار اور نٹ کھٹ
دل لیں ہیں یوں کہ ہرگز ہوتی نہیں ہے آہٹ

شمس الرحمٰن فاروقی موخر الذکر شعر کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:
''شعر میں تھوڑی بہت ہوسنا کی اور ڈھیر ساری ہے۔ لفظیات بھی

Scanned by CamScanner

دلچسپ اور ظرافت کو معاون ہے .... ظرافت اور غزل میں کوئی تناقص نہیں ہے۔ ہمارے شعراء نے شروع سے ہی غزل کے دامن کو وسیع رکھا ہے۔ بیسویں صدی میں یہ غلط خیال عام ہوا کہ غزل میں ظریفانہ عنصر نہ ہونا چاہیے .... خوش طبعی، چھیڑ چھاڑ، مزاح یہ سب میرؔ کے بھی پہلے سے غزل میں موجود ہیں اور یہ محض سوداؔ یا انشاءؔ کی صفات نہیں ہیں۔ ناسخؔ اور ذوقؔ کا کلام بھی ظرافت سے مملو ہے بعد کے شعراء میں داغؔ کا کلام بھی نمونے کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے، اور خود غالب کے یہاں (جن کو عام طور پر بڑا دقیق فلسفی کہا جاتا ہے) مزاح موجود ہے۔ لہذا میرؔ کے یہاں اس طرح کے اشعار میں امرد پرستی اور ہوسنا کی ہی نہیں، بلکہ ظرافت اور شوخی کا بھی اظہار ہے۔ اس پر ناک بھوں چڑھانے کی ضرورت نہیں۔ غزل کا شاعر زندگی کے ہر شعبے پر حاوی ہوتا ہے"۔ ۳

شمس الرحمٰن کی یہ بات درست ہے کہ غزل کا شاعر زندگی کے ہر شعبے پر محیط ہوتا ہے لیکن وہ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ ہر صنفِ سخن کے کچھ اپنے تقاضے بھی ہوتے ہیں۔ غزل جیسی سنجیدہ شاعری میں غیر سنجیدگی کی ایک حد تک گنجائش ہے لیکن اگر غزل کا شعر تغزل سے یکسر عاری ہونے کے ساتھ ساتھ (ہلکی سی نشاطیہ کیفیت کے بجائے) پھکڑ پن کا نمونہ پیش کرے تو ایسی شاعری کی حمایت کرنا کوئی مستحسن بات نہیں ہے کیونکہ پھکڑ پن نشاطیہ کیفیت کے علی الرغم طبیعت میں انقباض پیدا کرتا ہے۔ میرؔ کے مذکورہ بالا اشعار اخلاقی اور فکری وفنی اعتبار سے بھی میرؔ کے ان اشعار کے ساتھ لگا نہیں کھاتے جو ان کو اردو کا بہت بڑا غزل گو شاعر ثابت کرتے ہیں۔ ان اشعار کی اگر کچھ اہمت بنتی ہے تو فقط یہ کہ ان اشعار نے اردو غزل کو بے رحم سنجیدگی کے حصار سے نکالنے کی سعی کی ہے۔

Scanned by CamScanner

تکرار الفاظ کی بدولت میرؔ کے کلام میں وہ موسیقیت در آئی ہے جسے ایک طرف اگر پڑھنے والے کی زبان چٹخارے بھرتی ہے تو دوسری طرف سننے والے کے لیے یہ اصوات فردوس گوش بن جاتی ہیں۔ چند اشعار دیکھیے:

کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے
اس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے

عالم عالم عشق و جنوں ہے دنیا دنیا تہمت ہے
دریا دریا روتا ہوں میں صحرا صحرا وحشت ہے

پتا پتا، بوٹا بوٹا، حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

جہاں تک بحور اور ان سے جنم لینے والی نفسی کیفیات کا تعلق ہے، طویل بحریں نشاطیہ آہنگ کی تشکیل میں زیادہ ممد و معاون ثابت ہوتی ہیں۔ میرؔ کے ہاں طویل بحریں بالخصوص بحر میرؔ کا صامعہ نواز صوتی آہنگ قاری کے دل میں پر مسرت جذباتی کیفیات کو جنم دینے کے ساتھ ساتھ، زخم خوردہ، پژمردہ اور مضمحل روح میں انبساط و اہتزاز کی لے بن کر رقص کرنے لگتا ہے حتی کہ غم انگیز مضمون بھی جب بحر میرؔ کے سانچے میں ڈھلتا ہے تو قاری کا دل پر مسرت جذبات سے مملو ہو جاتا ہے اور انبساط و اہتزاز کی زیریں لہر آہستہ آہستہ قاری پر مستولی ہو جاتی ہے۔

دور بہت بھاگو ہو ہم سے، سیکھ طریق غزالوں کا
وحشت کرنا شیوہ ہے کچھ اچھی آنکھوں والوں کا

تب تھے سپاہی اب ہیں جوگی، آہ جوانی یوں کاٹی
ایسی تھوڑی رات میں ہم نے کیا کیا سوانگ بنائے ہیں

چلتے ہو تو چمن کو چلیے سنتے ہیں کہ بہاراں ہے
پھول کھلے ہیں پات ہرے ہیں کم کم بادو باراں ہے ۔

ڈاکٹر حامدی کاشمیری کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ:

''غم اور اس کی مختلف شیڈس ہی ان کی کل کائنات نہیں، اس کے علی الرغم ان کے یہاں نشاطیہ کیفیت کے قوس قزحی رنگ بھی جھلکتے ہیں، میر غم فراق ہی کے شکوہ کناں نہیں ہے بلکہ لذت وصال کے کیف شناس بھی ہیں''۔ ۴

اب آپ خود ہی بتایئے کہ کیا میر کو شاعرِ غم قرار دے کر میر کی شخصیت اور شاعری کی بوقلمونی اور مختلف فکری وفنی ابعاد کا صحیح ادراک ممکن ہے یا نہیں۔

حوالہ جات

۱۔ شکیل الرحمٰن، پروفیسر، المیہ کی جمالیات، خدا بخش لائبریری جرنل پٹنہ، ص۴۔

۲۔ مسز افتخار بیگم صدیقی، ڈاکٹر، محسوسات کا شاعر ولی، اردو غزل مرتبہ از ڈاکٹر کامل قریشی، پروگریسو بکس، لاہور، باراول 1989ء، ص 88۔

۳۔ شمس الرحمٰن فاروقی، شعر شور انگیز، جلد دوم، باراول 1991ء، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ص 177,178۔

۴۔ حامدی کاشمیری، ڈاکٹر، مقدمہ، انتخاب غزلیات میر، باراول 2000ء، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ص 10۔

Scanned by CamScanner